© rasailojaraid.com

قاضی جاوید

المیے کی یادیں

۱۹۷۱ء کے سقوط ڈھاکہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، چند کتابیں پاکستان میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ بھارتی اور بنگلہ دیشی مصنّفین نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ بیرونی دنیا میں بھی اس المیے پر کام ہوا ہے۔ اس سال بنگلہ دیش اپنی پچیسویں سالگرہ منا رہا ہے تو اس موضوع پر از سرنو بحث شروع ہو گئی ہے۔ حال ہی میں مجھے ایک بنگالی مصنف ڈاکٹر سید سجاد حسین کی مشرقی پاکستان کے زوال و سقوط پر ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بنگلہ دیش میں خالص پاکستانی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس حوالے سے اس المیے کے بعض پوشیدہ پہلوؤں کو روشنی میں لائی ہے۔

۱۹۲۰ء میں پیدا ہونے والے سید سجاد حسین نے ڈھاکہ اور نوٹنگھم (برطانیہ) کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی۔ وہ قیام پاکستان کے ایک سال بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں ان کو پروفیسر بنا دیا گیا اور ۱۹۶۹ء میں ان کو راجشاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ دیا گیا۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں جب پورے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک عروج پر تھی تو سید سجاد حسین کو ڈھاکہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ سید سجاد حسین ان لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے طالب علمی کے زمانے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریک پاکستان میں دل و جان سے حصہ لیا تھا۔ یہ ملک ان کے لیے عطیہ خداوندی تھا اور جزو ایمان بن گیا تھا' اس ملک نے بھی ان کو عزت و وقار عطا کیا لیکن ملک سے ان کی وفاداری سود و زیاں سے بالاتر تھی۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک کے آغاز ہی میں انہوں نے پاکستان سے وفاداری کا اعلان کیا اور آخری سانس تک اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی انہوں نے اپنی وفاداریاں نہ بدلیں۔

اس وفاداری کی سید سجاد حسین نے بھاری قیمت ادا کی ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے فوراً بعد ڈھاکہ میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ مکتی باہنی والوں نے پاکستان کا حامی اور "غدار" قرار دیتے ہوئے ان کی جان لینے کی کوشش کی۔ اس حملے میں وہ شدید زخمی ہوگئے اور کوئی شخص ان کو ہسپتال تک لے جانے پر تیار نہ تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان کے اس بڑے حامی کی زندگی کی حفاظت بھارتی فوجیوں نے کی۔ وہ سید صاحب کو ہسپتال لے کر گئے اور ان کے کمرے کے باہر پہرہ دیتے رہے۔

شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ اور مکتی باہنی کے نزدیک سید صاحب کے خلاف ایک "جرم" یہ تھا کہ جولائی ۱۹۷۱ء میں انہوں نے یحیٰی خان کی حکومت کی درخواست پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے برطانیہ اور امریکہ کا دورہ کیا تھا اور وہاں لوگوں کو بتایا کہ مشرقی پاکستان میں اصل جنگ پاکستان کے وفاداروں اور باغیوں کے درمیان جاری ہے۔

اس "جرم" کی پاداش میں قاتلانہ حملے کے بعد ہسپتال سے ڈھاکہ سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں وہ دو سال تک قید رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی یادداشتیں قلمبند کیں۔ یہ یادداشتیں آپ بیتی سے زیادہ مشرقی پاکستان کی کہانی ہے۔ سید سجاد حسین نے ان سازشوں' کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ چاک کیا ہے جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہوئیں اور بالاخر ۱۹۷۱ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے آخر میں بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہوئیں۔

ظاہر ہے کہ سترکے عشرے میں یادداشتوں کی بنگلہ دیش میں اشاعت ممکن نہیں تھی، اس لیے سید سجاد حسین خاموش رہے اور جذبوں کے معمول پر آنے کے منتظر رہے تاکہ جو باتیں انہوں نے کہی ہیں، ان پر سنجیدگی سے توجہ دینے کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو جائے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ سعودی عرب چلے گئے اور مکہ یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے لگے۔ دس سال قیام کے بعد ۱۹۸۵ء میں وہ واپس آئے اور ریٹائرڈ زندگی بسر کرنے لگے۔ ان ایام میں انہوں نے پانچ کتابیں لکھیں اور آخرکار بائیس برس کے طویل وقفے کے بعد اپنی یادداشتیں کتابی صورت میں اشاعت کے لیے پبلشر کے حوالے کر دیں۔ یہ کتاب The Wastes of Time کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا ذیلی عنوان "مشرقی پاکستان کے زوال اور سقوط پر خیالات" ہے۔ یہ کتاب گزشتہ برس فروری میں ڈھاکہ کے نوتن پروکاشنی (۴۴ پرانا پلٹن، ڈھاکہ) نے شائع کی ہے۔ اس کی اشاعت سے چند روز پہلے سید سجاد حسین کا انتقال ہوگیا تھا۔

یہ قیمتی کتاب کتابوں سے گہری محبت رکھنے والے، سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل صاحب کے کسی طور ہاتھ لگ گئی۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر صاحب یہ کتاب لے کر آئے۔ وہاں چائے کے وقفے میں انہوں نے کتاب اور صاحب کتاب دونوں کی بہت تعریف کی اور کتاب کے بنیادی تصورات کی وضاحت بھی کی۔ ڈاکٹر صاحب کتابوں کے معاملے میں ہمیشہ مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں اور کئی عمدہ کتابیں مجھے ان کی وساطت سے پڑھنے کو ملی ہیں۔ سید سجاد حسین کی کتاب بھی انہی کے سبب ہاتھ آئی۔ یہاں میں یہ بھی عرض کروں کہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے اس کتاب کا ایک خوب صورت ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔ جو وطن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عزیز کی سیاسی تاریخ کے سنجیدہ قارئین کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہے۔

مشرقی پاکستان کے زوال کی داستان کا آغاز سید سجاد حسین قیام پاکستان کے ساتھ ہی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈھاکہ میں نئی حکومت نے ابھی مناسب طور پر کام شروع ہی نہیں کیا تھا کہ دو قومی نظریے کے خلاف مہم شروع ہوگئی۔ پاکستان اسی نظریے پر قائم ہوا تھا۔ اس کے قیام کے فوراً بعد یہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اس نظریے کا کوئی جواز نہیں رہا اور یہ کہ اس نظریے پر زور دیا گیا تو مشرقی پاکستان کو بھی تقسیم کرنا پڑے گا کیونکہ اس کی آبادی میں دس فیصد تک ہندو موجود تھے۔ دو قومی نظریے کی رو سے اگر ہندو علیحدہ قوم ہیں، تو کیا ان کو الگ ریاست کا حق نہیں دیا جائے گا۔

اس قسم کے خیالات پھیلانے والوں نے ہندوستان کے پس منظر اور دو قومی نظریے کی تاریخ کو بھلا دیا تھا۔ وہ اصرار کرتے تھے کہ اس نظریے کے مطابق گلی گلی اور گاؤں گاؤں تقسیم ہو جائیں گے۔ یوں لوگوں کو گمراہ کیا جانے لگا اور ان کی نظروں میں ان کے ملک کی نظریاتی اساس کو مشتبہ بنانے کا عمل شروع کر دیا گیا۔

یہ لوگ پاکستان کے حصے بخرے کرنے کی باتیں سرعام تو نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان کی بقاء اس کی قومی یکجہتی سے وابستہ ہے اور یکجہتی کا تقاضا یہ ہے، کہ پاکستانیوں میں تفریق نہ کی جائے اور جداگانہ انتخابات کا نظام ختم کر دیا جائے۔ نئی نسل اور خاص طور پر یونیورسٹیوں کے طالب علم جو قومیت کے مغربی تصورات اپنی درسی کتابوں میں پڑھتے تھے، وہ اس منطق سے زیادہ متاثر ہوئے۔ حد یہ ہے کہ حسین شہید سہروردی جیسے صاحبان بھی اس انداز فکر کی حمایت کرنے لگے، چنانچہ سہروردی نے اسمبلی میں اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ جداگانہ انتخابی نظام کا خاتمہ پاکستان کے مفاد میں ہے۔ یوں پاکستان کی بنیادوں کو مستحکم کئے بغیر ہی مشترکہ پاکستانی قومیت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چرچا شروع ہوا تو اس نئی مملکت کی نظریاتی اساس خطرے کی زد میں آ گئی۔

مشرقی پاکستان کے پس منظر میں اس کے نتائج زیادہ واضح تھے۔ وہاں کی آبادی میں غیر مسلموں کی تعداد دس فیصد کے لگ بھگ تھی' چنانچہ وہاں مسلمان سیاست دان ہندوؤں کے ووٹ لینے کی خاطر دو قومی نظریے سے پہلو بچانے لگے۔ سیاسی جماعتیں غیر مسلم ووٹرز کو نظرانداز نہیں کرسکتی تھیں۔ انہوں نے مسلم ثقافتی مفادات کو پس پشت ڈالا اور اس کی بجائے سیکولر اقدار پر زور دینے لگیں۔ ہندوستان کے پس منظر میں سیکولرازم کا مطلب یہ تھا کہ ہندو تو اپنے مذہب اور فلسفے کا آزادی سے چرچا کرسکتے ہیں لیکن مسلم روایات کا ذکر تنگ نظری کی علامت ہے' جس سے ہر پڑھے لکھے شخص کو دامن بچانا چاہیے۔

سید سجاد حسین نے مشرقی پاکستان کے ایک اور معاملے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ تقسیم کے موقع پر مشرقی بنگال سے اونچی کلاس کے ہندو بھارت چلے گئے تھے۔ درمیانے طبقے کے بھی اکثر ہندوؤں نے مغربی بنگال کا رخ کر لیا تھا' جب کہ نچلے طبقے کے ہندو وہیں رہ گئے تھے۔ یوں نئی نسل کے مشرقی پاکستانیوں کے سامنے استحصال کرنے والے ہندو نہیں رہے تھے اور ان کو یہ بات سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کا استحصال کیا کرتے تھے' جس کے سبب تقسیم ضروری ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد شعور حاصل کرنے والی نسل کو ہندوؤں کی زیادتیوں' تنگ نظری اور چھوت چھات کا احساس دلانا مشکل تھا۔ وہ نسل ان باتوں کو مبالغہ آمیز قصے کہانیاں خیال کرنے لگی تھی۔

سید سجاد حسین کہتے ہیں کہ یہ طرز احساس رفتہ رفتہ ایک نظریے میں ڈھلنے لگا۔ سب سے پہلے راج شاہی یونیورسٹی کے پروفیسر قمرالدین احمد نے اپنی انگریزی کتاب "مشرقی پاکستان کی سماجی تاریخ" میں دو قومی نظریے کو چیلنج کیا۔ اس کے بعد بدرالدین عمر نے بنگالی زبان میں کئی کتابیں لکھیں' جن میں مسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنگال کی نئی قوم پرستی کے حوالے سے تحریک پاکستان کا جائزہ لیا گیا تھا۔
بدرالدین عمر کی ایک بنگالی کتاب کا عنوان "ثقافت میں بحران" ہے۔ اس کتاب کا مشرقی پاکستان میں بہت چرچا ہوا تھا۔ اس کو بڑے پیمانے پر پڑھا گیا اور اس پر بہت سی بحثیں ہوئیں۔ طالب علموں' ادیبوں' دانش وروں اور عام پڑھے لکھے لوگوں میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ ان طبقوں نے "ثقافت میں بحران" کا بہت سا اثر قبول کیا۔

بدرالدین عمر نے اپنی اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندو اور مسلم طرز حیات میں کوئی فرق نہیں۔ کم از کم بنگال کی حد تک دونوں یکساں ہیں۔ دونوں کے کھانے' لباس اور رہن سہن ایک جیسے ہیں۔ بس شادی کی بعض رسمیں ضرور مختلف ہیں۔ اس رسم کی بحث کے بعد بدرالدین عمر نے لکھا تھا کہ صدیوں سے ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے چلے آرہے تھے' تاہم فرقہ پرستوں نے ان میں نفرتیں پیدا کر دیں۔

اس طرح بدرالدین عمر نے وہ تمام سیاسی بحثیں دوبارہ شروع کر دیں جو ۱۹۴۷ء کی عظیم تقسیم سے ختم کی جاچکی تھیں۔

بدرالدین عمر اور ان جیسے دوسرے دانش ور پاکستان کی بنیاد پر حملے کر رہے تھے تو دوسری طرف سیاست دان ایک کے بعد دوسری غلطی کیے جا رہے تھے۔ قیام پاکستان کے اولین برس آئین سازی کے عمل نے ضائع کر دیے۔ سید سجاد حسین کا اس بارے میں اپنا ایک نقطہ نظر ہے' چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ نئے آئین کی تدوین بالکل فضول سی بات تھی۔ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کی صورت میں اس ملک کو آئین پہلے سے حاصل تھا' چنانچہ اس کو قائم رکھا جاسکتا تھا اور نئے حالات کے تقاضوں کے بمطابق وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلیاں ہوسکتی تھیں۔

اس حقیقت پسندی کے بجائے نئے ملک کے حکمرانوں نے رومان پرستی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مظاہرہ کیا اور نیا آئین بنانے لگ گئے۔ اس کام میں سات قیمتی سال ضائع ہوگئے۔ اس طرح عوام بھی محسوس کرنے لگے کہ ان کے حکمران آئین بنانے کی اہلیت نہیں رکھتے اور ان کو اس کام میں دلچسپی نہیں ہے۔ اور وہ محض اقتدار کے بھوکے ہیں اور اقتدار کو طول دینے کی خاطر انہوں نے آئین سازی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

یوں عام لوگ حکمران مسلم لیگ سے دور ہونے لگے اور اس جماعت کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ حسین شہید سہروردی نے اس جماعت کو خیرباد کہا اور اپنی عوامی مسلم لیگ بنالی۔ انہوں نے یہ کہنا بھی شروع کردیا کہ اپنی نااہلی کے باعث دستور ساز اسمبلی دستور سازی کے حق سے محروم ہوگئی ہے۔ اس سے پنجاب میں مسلم لیگ کے مخالفوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ان کے زیر اثر گورنر جنرل غلام محمد نے پہلے' وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کردیا' اور پھر دستور ساز اسمبلی توڑ ڈالی۔ اس طرح قانون و آئین کی بالادستی کا وہ سارا ڈھانچہ مسمار ہوگیا جو انگریزوں نے بنایا تھا۔

اگلا قدم جنرل ایوب خان کا مارشل لاء تھا جس کی راہ غلام محمد نے ہموار کردی تھی۔ جب ایوب خان نے ملک کو سیاسی استحکام دینے کے اقدامات شروع کیئے تو سہروردی نے ان کی مخالفت شروع کردی۔ اس کی وجہ جمہوریت سے محبت نہیں بلکہ اقتدار کی شدید خواہش تھی۔

ایوب خان کے زمانے ہی میں عوامی لیگ نے چھ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا جو کھلم کھلا علیحدگی کا اعلان تھا۔ ۱۹۶۷ء میں شیخ مجیب الرحمان کے خلاف اگر تلہ سازش کیس بنا۔ ایوب خان کے مخالف اس کو سیاسی کھیل سمجھتے تھے اس لئے وہ اس پر سنجیدگی سے توجہ نہ دے سکے اور نہ ہی اس سازش کو سمجھ سکے۔ جب سیاسی سمجھوتے کے لئے ایوب خان نے گول میز کانفرنس بلائی تو کئی لیڈروں نے شرکت کے لئے شیخ مجیب الرحمان کی رہائی اور اگر تلہ کیس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واپسی کی شرط رکھی۔ ایوب خان جواب فیلڈ مارشل تھے' اس محاذ پر جم نہ سکے۔ انہوں نے مقدمہ واپس لے لیا۔ یوں عوامی لیگ نے یہ سبق سیکھا کہ وہ اپنے غیر معقول رویے اور تشدد کے ذریعے آگے بڑھ سکتی ہے۔ اس کے حوصلے بلند ہوگئے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لئے اس کے کھیل کے آخری ایکٹ پر عمل شروع ہوگیا۔

اپنی یادداشتوں میں سید سجاد حسین ؒ نے فیلڈ مارشل کی اس پسپائی پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایوب خان اور سیاستدانوں کو دانائی سے کام لینا چاہئے تھا اور مجیب الرحمان کے خلاف مقدمہ ختم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سید صاحب نے فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور کے ایک اور رجحان کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس نے ان کے خیال میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ وجہ ان کو معلوم نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب فیلڈ مارشل ایوب خان جناب الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب کے زیر اثر آئے تو مشرقی پاکستان میں دائیں بازو کے لوگوں کو نظرانداز کرنے اور اشتراکیوں کے ناز اٹھانے کی مسلسل و منظم کوشش شروع ہوگئی۔ الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب دونوں بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والے سی ایس پی افسر تھے۔ دائیں بازو والوں کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنی جیب میں ہی ہیں یا پھر ان سے ایسے احمقوں جیسا سلوک شروع ہوا جن کی نظریہ پاکستان سے بے تکی وفاداری حکمرانوں کے نزدیک مسائل حل کم کرتی اور پیدا زیادہ کرتی تھی۔

مشرقی پاکستان میں منیر چودھری کو الطاف گوہر صاحب سے سب سے زیادہ قریبی سمجھا جاتا تھا۔ وہ پورے مشرقی پاکستان کی بائیں بازو کی تحریک اور الطاف گوہر صاحب کے درمیان رابطے کا کام دیتے تھے اور سید سجاد حسین کا خیال ہے کے منیر چودھری نے الطاف گوہر صاحب کو ضرور یہ پٹی پڑھائی ہوگی کہ اشتراکیوں سے متعلق شکوک و شبہات بے بنیاد ہیں۔ یہ نہیں تو پھر ہو سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کے الطاف گوہر صاحب دل ہی دل میں جان گئے ہوں گے کہ پاکستان کا خاتمہ ناپسندیدہ نہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ الزام بہت سخت ہے اور واضح ثبوت کے بغیر کسی شخص پر اس قسم کا الزام عائد نہیں کرنا چاہئے۔ الطاف گوہر صاحب تو بہرطور اہم شخصیت ہیں ان کے معاملے میں زیادہ احتیاط ہونی چاہیے تاہم سید سجاد حسین بتاتے ہیں کہ اگر یہ الزام درست ہو تو ان کو کوئی حیرت نہیں ہوگی۔ اس موضوع پر ہو مزید لکھتے ہیں کہ ”ممکن ہے کہ الطاف گوہر صاحب نے ایوب خان کی دل وجان سے خدمت کی ہو تاہم اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اشتراکی ہوتے ہوئے پاکستان کی بقاء میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک شہری کے طور پر ان کے ریکارڈ میں ایسی کوئی بات نہیں جو نظریۂ پاکستان سے ان کے اعتقاد کی نشاندہی کر سکے۔ ذاتی طور پر وہ لائق، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن اخلاق کی بات اور ہے۔...“

وقت کے ساتھ ساتھ الطاف گوہر صاحب ترقی کے زینے طے کرتے چلے گئے۔ جب وہ مرکز میں شامل ہونے کے لئے مشرقی پاکستان سے روانہ ہوئے تو اپنے ایسے بہت سے چاہنے والے چھوڑ گئے جو ان کی ذاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے امیدوار تھے۔ سید سجاد حسین کا دعوی یہ ہے کہ الطاف گوہر صاحب نے اپنے ان دوستوں کو مایوس نہیں کیا۔ ایوب خان کے زمانے میں جب ان کو قوت حاصل ہوئی اور وہ ایسے عہدے پر آگئے جہاں سے وہ عملاً پورے پاکستان پر حکم چلا سکتے تھے تو مشرقی پاکستان میں ان کے دوستوں کے بھی وارے نیارے ہو گئے۔ ان لوگوں پر فیلڈ مارشل کی مہربانیاں ہوتی رہیں اور وہ اس آڑ میں اپنے مذموم مقاصد حاصل کرتے رہے۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ نے ڈھاکہ سے ”دینک پاکستان“ کے نام سے بنگالی زبان کا ایک روزنامہ جاری کیا اس اخبار میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشتراکیوں کو بھرتی کیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا کم وبیش سارا اسٹاف ہی اسی قسم کے لوگوں پر مشتمل ہو گیا۔ اس میں ایسی خبریں، اداریئے اور مضامین شائع ہوتے تھے جن میں بین السطور پاکستان کے خلاف نفرت کو ہوا دینا اور نظریہ پاکستان پر لوگوں کے یقین کو ختم کرنا تھا۔ بنگالی زبان کو اچھی طرح سمجھنے والے آسانی سے جان سکتے تھے کہ اس سرکاری اخبار میں پاکستان کے خلاف مہم چلائی جارہی تھی۔

قدرت اللہ شہاب مرحوم کا معاملہ سید سجاد حسین کی نگاہوں میں، مختلف نہیں تھا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سوشلسٹوں اور بائیں بازو کے دوسرے عناصر کی سرپرستی کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ اس صوبے کی باقی پاکستان سے علیحدگی کے حامی تھے اور علیحدگی کی جو تحریکیں مشرقی پاکستان میں ایوب خان کے زمانے میں چل رہی تھیں یا جو گروپ علیحدہ کے لیے کام کر رہے تھے، ان میں بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والوں کی بڑی تعداد شامل تھی۔ جب الطاف گوہر صاحب، قدرت اللہ شہاب اور دوسرے بااثر صاحبان نے ان کی سرپرستی کی تو مشرقی پاکستان میں ان کو قوت حاصل ہونے لگی۔ سید سجاد حسین کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے رجحانات کو خود مرکز سے حاصل ہونے والی قوت کے بل بوتے پر پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ دوسری طرف جو لوگ پاکستان کے حامی اور نظریہ پاکستان پر ایمان رکھتے تھے، ایوب خان کے دور میں ان کو دھکیلا جانے لگا۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور ان کی توہین کی جا رہی ہے۔ اس احساس نے ان کو مایوس کر دیا اور وہ اپنی صلاحیتوں کو پاکستان کے دشمنوں کے خلاف بھرپور انداز میں استعمال نہ کرسکے، یہی بات بالاخر مشرقی پاکستان کے زوال کا سبب بنی۔

۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے اسباب و واقعات کا فہم حاصل کرنے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم جس قدر زیادہ کوشش کریں، اتنے ہی زیادہ وہ تعجب انگیز نظر آتے ہیں، سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بنگال کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں دوسرے صوبوں سے کچھ زیادہ ہی حصہ لیا تھا۔ وہ اس تحریک میں سرگرم رہے تھے لیکن قیام پاکستان کے چند ہی برس بعد عوامی لیگ نے ان کے ذہنوں میں زہر اس قدر کامیابی سے اتار دیا تھا کہ وہ پاکستان کے نام سے بھی بے زار ہوگئے اور بالاخر اس کے خاتمے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے۔ بلاشبہ عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان کے تمام شہریوں کی تائید حاصل نہ تھی۔ اس کے مخالف موجود تھے اور پاکستان کو قائم رکھنے کی خواہش کرنے والے بھی بہت تھے، لیکن ۱۹۷۰ء تک عوامی لیگ نے ایسی پوزیشن حاصل کرلی تھی جس کو چیلنج کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے یہ کامیابی سازشوں اور سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعے حاصل کی تھی، جو لوگ اس کے مخالف تھے، وہ بھی اس کے بنیادی موقف کی نفی کرنے کی جرات نہیں کرسکتے تھے بلکہ مخالفین خود کو صوبائی مفادات کا عوامی لیگ سے بھی بڑھ کر حمایتی ثابت کرنے لگے تھے۔

۱۹۶۸ء اور اس کے بعد مشرقی پاکستانیوں کے ہجوم ڈھاکہ کی سڑکوں پر راولپنڈی کی زنجیروں سے نجات کے نعرے لگانے لگے تھے۔ آخر ان کو کیونکر محسوس ہوا کہ ان کو ان کی مرضی کے خلاف راولپنڈی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے، سرحد پار کا بھارتی پریس اور سیاستدان ان باغیوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مشرقی پاکستانیوں نے تاریک ماضی کو بھلا دیا اور سمجھنے لگے کہ ان کے دوست صرف بھارت میں ہیں اور جب وہ پاکستان سے نجات پائیں گے تو بھارت کی مدد سے خوشحال ہو جائیں گے، حالیہ تاریخ میں سیاسی متلون مزاجی کی اس قسم کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، سید سجاد حسین کے الفاظ میں وہ بے وفائی، غداری، حماقت، کوتاہ نظری، فریب کاری، جہالت، بے حسی اور تکبر کی المناک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہانی ہے۔ ان سب نے مل کر ۱۹۷۱ء کے المیے کو جنم دیا' جس کے اثرات سے نجات اگر ممکن ہوئی بھی تو بہت دیر سے ہوگی۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد وقت نے کئی اور رازوں کو بھی فاش کر دیا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۱ء ہی کے سیاسی بحران کے زمانے میں مشرقی پاکستان کے بعض سیاسی رہنما مغربی پاکستان سے کنفڈریشن کے لیے سوچ رہے تھے۔ لیکن بات آگے نہ بڑھی' اب جب کہ پاکستان اپنی پچاس سالہ "سنہری" جوبلی منا رہا ہے' پاکستان کے ارباب دانش' اصحاب فکر اور سنجیدہ سیاست دانوں سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے بنگالی بھائیوں سے مل کر پاکستان اور بنگلہ دیش کی کنفڈریشن پر بات چیت کریں گے' صبر و تحمل' صدق و صفا' صاف گوئی اور قومی خدمت کی ایک لمبی راہ پر چل کر اپنے مذاکرات کو کامیاب بنائیں گے اور دونوں قوموں کو یہ خوش خبری سنائیں گے کہ وہ سیاسی افق پر ایک نئی صبح کے مسکرانے کا نظارہ کریں۔

© rasailojaraid.com